ارضِ مجاہدین: کوئے جاناں میں کُھلا میرے لہو کا پرچم

اردو شاعری سے درد و دکھ کے بے مثال موتیوں کا انتخاب

عراق، افغانستان اور اسلام آباد کے فرشتہ صفت بچوں کے لیے

معصوم بچوں کی ماں کی خدمت میں:

کہیں صبر کی نصیحت کہیں شکر کا ترانہ
ترے آنسوؤں کی قیمت نہ چکا سکا زمانہ

مٹتے ہوئے دیکھی ہے عجب حسن کی تصویر
اب کوئی مرے مجھ کو ذرا غم نہیں ہوتا

معصوم بچوں کی بے زبانی:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

تعجب کیا جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں انھیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

اک برگ سبز شاخ سے کر کے جدا بھی دیکھ
میں پھر بھی جی رہا ہوں مرا حوصلہ تو دیکھ

راہ گزر ہی رہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حد نظر سے آگے بھی

سوچ سمجھ کر ہم نے آخر شعلوں کی دنیا چن لی ہے
ورنہ نشیمن بن سکتا تھا برق و شرر سے آگے بھی

دل کا تعاقب کرتے کرتے ہانپ رہی ہے سعی ستم
دار و رسن کیا جاسکتے ہیں گردن و سر سے آگے بھی

دوستو میرے ساتھ یہ نیکی
تم نہ کرتے تو کیا عدو کرتے

پتہ نہیں مرے بعد ان پہ کیا گزری
میں چند خواب زمانے میں چھوڑ آیا تھا

فصیلِ شہر میں پیدا کیا تھا در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

بغور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کے
یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا

قریب سرحد حرماں جگر ٹھہر جاؤ
سنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گزرے گا

جہاں رہیں گے وہیں روشنی لٹائیں گے
کسی چراغ کا کوئی مکاں نہیں ہوتا

یہ غم نہیں کہ سردارِ آئے جاتے ہیں
ہمیں خوشی ہے وطن کو جگائے جاتے ہیں

ہمارے بعد سہی رات ڈھل تو جائے گی
دلوں میں شمعیں جنوں تو جلائے جاتے ہیں

ہمارے نقش قدم دیں گے منزلوں کے سراغ
ہمیں شکست نہ ہوگی بتائے جاتے ہیں

جواں رہے گی ہمارے لہو کی یہ تحریر
سدا بہار شگوفے کھلائے جاتے ہیں

ستون دار پہ کب تک رکھیں سروں کے چراغ
یہ ہاتھ شل ہوئے جاتے ہیں سر بدلتے ہوئے

سر بہ کف دیکھا ہے یا سر بہ کفن دیکھا ہے
مرنے والوں کا عجب ہم نے چلن دیکھا ہے

ایسا منظر تو چمن میں بھی نہ دیکھے بلبل
آج ہم نے جو سرِدار و رسن دیکھا ہے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

اپنی بربادی قسمت پہ بھی نازاں ہے کوئی
کہہ دو سر پیٹ لے اب گردش دوراں اپنا

جل گیا اپنا نشیمن تو کوئی بات نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ اب آگ کدھر جاتی ہے

ساری دنیا میں شہیدوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

اے دہر ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

چپ ہے ہر زخم گلو چپ ہے شہیدوں کا لہو
دست قاتل ہے کہ محنت کا صلہ مانگے ہے

ہر دھند لکے میں کئی نقش نظر آتے ہیں
شمع جلتی ہے تو تصویر بدل جاتی ہے

فرق کچھ بھی نظر آتا نہیں زندانوں میں
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

مری موت جیسے مجھ سے کوئی بات کہہ گئی ہو
جسے سن کے زندگانی وہیں جم کے رہ گئی ہو

کہ اندھیرے راستوں پر کبھی پھر دیئے جلیں گے
جو گلوں کا بانکپن تھے وہی لوگ پھرملیں گے

ایک گھر ایسا بھی ہے شیش محل کے لوگو
جس میں دیوار نہ آنگن نہ دریچے ہوں گے

مجھے زخم دینے والے تو سدا رہے شگفتہ
تجھے آنچ تک نہ آئے تو ملال تک نہ پہنچے

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے یہ اذان صبح گاہی
ترے عہد کے مؤذن تو بلال تک نہ پہنچے

شب سیاہ کی تردید کی ضرورت ہے
کبھی قمر کبھی خورشید کی ضرورت ہے

ہمیں سے اپنی نوا ہمکلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

اک گردن محکوم کہ ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعل دل فیض چھپاؤ تہہ داماں
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سر افراز رہے گا

مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

ہمسفر اور بھی سر گرم سفر تھے لیکن
مجھ کو صیاد نے رفتار سے پہچان لیا

اٹھانا بزم سے آساں نہیں ہے
اٹھوں گا فتنۂ محشر اٹھا کر

اے شام بے سحر مرا احترام کر
میں آخری چراغ ہوں تیری فصیل کا

اماں کیسی ابھی تو موج خوں سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

دلوں کو دام میں لانا ہی شہر یاری ہے
خلوص سب سے بڑا اقتدار ہے ساقی

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اِک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

دنیا نے کب کسی کو کیا یاد عمر بھر
جو بات ہوگئی وہ خبر ہو کے رہ گئی

ضروری ہے کفن بردوش رہنا
وطن ہے کوچۂ قاتل ہمارا

ہمیں روکے گی کیا دیوار تہمت
محرک ہے خلوص دل ہمارا

ہماری آہ کو اور التجا کو
ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

آؤ دیکھیں اہل وفا کی ہوتی ہے توقیر کہاں؟
کس محفل کا نام ہے مقتل کھنچتی ہے شمشیر کہاں؟

سب کے ہونٹوں پر تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل تنہا

دنیائے وفا نام سے آباد رہے گی
گر میں نہ رہوں گا تو مری یاد رہے گی

مری نگاہ کی تصویر کوئی لے لیتا
اٹھا رہا تھا زمانہ اس آستاں سے مجھے

رند ہیں موت کے دھاروں میں ابھرنے والے
موت کے نام سے ڈرتے نہیں مرنے والے

تیغ دشمن سے جواں مرد بھی ڈرتے ہیں کہیں
خنجر دوست کے مارے ہوئے مرتے ہیں کہیں

کوئی گریاں قریب تربت ہے
زندگی پھر تری ضرورت ہے

خون سر بہہ گیا نیند آ گئی دیوانوں کو
بارشِ سنگ سے طوفانِ شرر سے پہلے

ہمارے چاک گریباں سے کھیلنے والو
ہمیں بہار کا سورج سلام کرتا ہے

ہمیں سے قوس و قزح کو ملی ہے رنگینی
ہمارے در پہ زمانہ قیام کرتا ہے

ذرا میں بھی تو دیکھوں وقتِ آخر اپنے پیاروں کو
مرے ماتم کی صف مرنے سے پہلے ہی بچھا دینا

جب فرق بے کلاہ ہوا چین آ گیا
راحت زیادہ تر ہو اگر تن پہ سر نہ ہو

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں
وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائیں

نظر بھی ساتھ رہی ہے قدم قدم پہ مری
پھرا ہے صحن چمن میں جہاں جہاں صیاد

سناؤں آہ کسے سرگزشتِ سیر چمن
نہ ہم خیال فلک ہے نہ ہم زباں صیاد

سربلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے

افغانستان، عراق اور اسلام آباد

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے

دریچے بے صدا کوئی نہیں ہے
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے

کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے

یہی ملال سا رہتا ہے کیا کہا جائے
عجیب حال سا رہتا ہے کیا کیا جائے

ہمارے شہر کے ہر نوجوان کے چہرے پر
یہی سوال سا رہتا ہے کیا کیا جائے

شجر پہ کوئی فرزند شجر باقی نہیں رہتا
مرا مطلب ہے ان پر بھی ثمر باقی نہیں رہتا

ہمارے شہر میں پستہ قدوں کی حکمرانی ہے
جو ان کے سر سے اونچا ہو وہ سر باقی نہیں رہتا

کئی دن سے مجھے بس اپنے گھر کی فکر لاحق ہے
منافق جس میں بستے ہوں وہ گھر باقی نہیں رہتا

ڈھونڈو گے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا
دیکھو گے تو ہر موڑ پہ مل جائیں گی لاشیں

ہر ایک موڑ پہ قاتل ہمارے اپنے تھے
یہ راز ہم پہ کھلا راہ گزر بدلتے ہوئے

امید کسی دل میں تر و تازہ نہیں ہے
وہ حال ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں ہے

بگڑی ہوئی اس شہر کی حالت بھی بہت ہے
جاؤں میں کہاں اس سے محبت بھی بہت ہے

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

کوئی تو ہے جو پرندوں کو بال و پر دے کر
زمیں کی قید سے آزاد بھی نہیں کرتا

غمگسار

اک چہکتے ہوئے بلبل کا گلا یوں گھونٹا
ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن قاتل ہوں
بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا؟

میں نے پوچھا تھا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں
ایک بچہ تری تصویر اٹھا لایا تھا

لے کے پھر اک شہید وفا کا لہو
اک دیا تیرگی میں جلایا گیا

قتل گاہوں سے چن کر تمہارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

ہے یہاں فرصت کردار نفس یک دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

تڑپ گیا ہوں نوا ہائے دلکشا کے لیے
پکار وادیٔ خاموش سے خدا کے لیے

جو اہل عشق ہیں نایاب ہوتے جاتے ہیں
یہ زندگی کے چلن خواب ہوتے جاتے ہیں

منادی شہر میں کردو کہ ڈھونڈو
وہ انساں آنکھ جس کی تر نہیں ہے

چلو اب موت کے رستے پہ لوگوں
اسی پہ زندگی کا ڈر نہیں ہے

قریب منزل آخر ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

یہ زمیں حق کی طلب گار ہے باطل باطل
سینۂ حق سے صدا آتی ہے قاتل قاتل

دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن
اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

جانے والے اک ترے جانے سے کیا باقی نہیں
زندگی کی بزم باقی ہے مگر ساقی نہیں

دو ایک آدمی ہی تو محفل کی جان تھے
دو ایک کیا گئے ہیں کہ سارے چلے گئے

تھمتے تھمتے ہی تھمیں گے آنسو
رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

تری یاد باقی ترا غم سلامت
بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں

اس سے کہنا کہ کہاں تک کوئی رستہ دیکھے
اس سے کہنا مرے چہرے سے یہ آنکھیں لے جائے

جامہ زیبوں پہ کفن نے ہے وہ ڈھایا جو بن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

ہزاروں پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو

کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے
صباء چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

چلو اب موت کے رستے پہ لوگو
اسی پر زندگی کا ڈر نہیں ہے

لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکوٰۃ ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

عجیب وغریب جذبات وکیفیات کا عکس:

وہ جو مصلحت کے سفیر تھے نہ ہوئے شریک سفر تو کیا
ترے غم کشوں کا یہ قافلہ ترے جاں نثار کے ساتھ ہے

ہوئیں بارشیں تو نہ آئے گا کوئی گرد باد نظر نہیں
ابھی اس کا بخت ہے اوج پر کہ ہوا غبار کے ساتھ ہے

نہ ہو دُور اپنے مقام سے کوئی پاس بھی نہیں آئے گا
ترے اردگرد ہماہمی ترے اعتبار کے ساتھ ہے

اک سفر ہے کہ جو کرنا ہے مگر جانتے ہیں
ان زمینوں میں کہیں بھی نہیں بستی اپنی

یہ بھی ممکن ہے فلک پر ہوں نشاں پیروں کے
یہ بھی ممکن ہے کہ دیوار میں رستا نہ بنے

دیار ذات کے تاریک بام و در سے گزر
ہوائے تازہ کسی دن ہمارے گھر سے گزر

شہادت اسم اعظم ہے شہادت کنز مخفی ہے
شہادت کا سبق قرطاس خونی پر ورق در ورق

شہادت تشنۂ تعبیر خوابوں کو جلا بخشے
زمین پر رینگنے والوں کو جینے کی بشارت دے

وفا کے قافلوں کو رنگ برنگی سی قبا دے دے
نوا دے دے وفا کا راستہ دے دے

شناخت کر کے بہایا گیا ہے میرا لہو
یہ تیرا وہم ہے قاتل مغالطے میں رہا

یہ زمیں حق کی طلب گار ہے باطل باطل
سینۂ حق سے صدا آتی ہے قاتل قاتل

تمام دائرے محدود ہیں بجز مقتل
لہو نے دیکھ لیا ہے بدن میں رہ کر بھی

ایک امید ہے رکھتی ہے جو دل کو شاداب
اک دریچہ ہے جو دریا کی طرف کھلتا ہے

مرا وجود مجھے دوڑنے نہیں دیتا
یہ ایک سنگ گراں راستوں میں ہے میرے

کبھی تو آئے گی دستک کسی اجالے کی
یہ تیرگی ہے مرے در پہ اور کتنی دیر

ہم کشتۂ عشق ہیں ہمارا
میدان کی خاک ہی کفن ہے

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

گر آج بچھڑے ہیں ہم کل تو پھر بہم ہوں گے
یہ ایک شب کی جدائی تو کوئی بات نہیں

اماں کیسی ابھی تو موج خوں سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

زندگی کی آخری کروٹ تھی موت
زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

اڑا کے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا
مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا

ستمگر تجھ سے امید کرم ہوگی جنھیں ہوگی
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

جب ارادہ جوان ہوتا ہے
حادثے راہ بھول جاتے ہیں

جنوں سے ہم نہ کوتاہی کریں گے
ہمارا ہاتھ پہنچے گا جہاں تک

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مری داستان پوری

لہو بے کس کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ ان کی آستیں پر

میں کس کے ہاتھ یہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ہر پل گزشتنی ہے تو پھر کیوں ملال ہو
ممکن ہے کل یہ وقت بھی خواب و خیال ہو

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو
میں جاچکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

حریمِ کعبہ بنادی وہ سر زمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

اٹھانا بزم سے آسان نہیں ہے
اٹھوں گا فتنۂ محشر اٹھا کر

اعضائے بدن سب لرزاں ہیں اک دل کے شہادت پانے سے
لشکر میں تلاطم برپا ہے سردار کے مارے جانے سے

کیا نزع کی تکلیفوں کا مزہ جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہرگام پر جب ماتم نہ ہوا

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے
کیوں چارہ ساز تجھ کو امید شفاء بھی ہے

تیرے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پھر دیکھ سکے گی گلِ تر کی صورت

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

افق کے اس پار زندگی کے اداس لمحے گزار آؤں
اگر مرا ساتھ دے سکو تم تو موت کو بھی پکار آؤں

اک دنیا ہے دشمن اپنی ایک زمانہ قاتل ہے
کس کس کے سر تہمت باندھیں کس کس کو بدنام کریں

وہ اپنا سر نہ تھا جسے آئی نہ سرکشی
جو سرنگوں ہوا وہ ہمارا علم نہیں

اے شام بے سحر تو مرا احترام کر
میں آخری چراغ ہوں تیری فصیل کا

سر دے کے سرخرو تھے کبھی بندگان عشق
رسم کہن تھی ختم ہوئی کوہکن کے ساتھ

کیا حوصلے تھے موت نے جن کو مٹا دیا
کیا ولولے تھے دفن ہوئے جو کفن کے ساتھ

مطرب خموش شیشہ نگوں جام پاش پاش
وہ انجمن کی بات گئی انجمن کے ساتھ

صحن گلشن میں فروغ تیرگی کو دیکھ کر
آشیانہ فرطِ غیرت سے جلا دینا پڑا

خلوص جبر و تشدد کی سخت راہوں سے
شکستہ پاء تھا مگر سر اٹھائے گزرا ہے

اجالا تجھ میں ہے جتنا بکھیر دے سارا
چراغِ آخر شب تیری زندگی کم ہے

رفیقو آج بھی کیا کوئی ہمسفر بچھڑا
ذرا گنو تو سہی ایک آدمی کم ہے

آج دل خوش ہوا اس طرز ستم پر اپنا
ہم تمہیں اہل ستم دادِ ستم دیتے ہیں

ہمارا غم نہ کریں سوچ کر یہ اہل وطن
بہت سے پھول چمن سے نکل بھی جاتے ہیں

دنیائے وفا نام سے آباد رہے گی
گر میں نہ رہوں گا تو مری یاد رہے گی

یہ مقتلِ منزلِ خبر و نظر تک آگیا ہے
لہو بہتا ہوا قاتل کے گھر تک آگیا ہے

خدا معلوم اس طائر کے دل پہ کیا گزرتی ہے
جو پر تولے ہوئے ہو اور زیرِ دام آجائے

محفل سے مجھے اپنی اٹھانے والے
میں تیرے تصور میں اتر جاؤں گا

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مرا ہم خیال ہو

کھل سکا حلقہ نہ جن سے زلف کی زنجیر کا
وہ بھلا کیا بل نکالیں گے مری تقدیر کا

رند ہیں موت کے دھاروں میں ابھرنے والے
موت کے نام سے ڈرتے نہیں مرنے والے

تیغِ دشمن سے جواں مرد بھی ڈرتے ہیں کہیں
خنجرِ دوست کے مارے ہوئے مرتے ہیں کہیں

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب دشت و چمن سحر سحر

قابل آشیاں کوئی نہ ملا
تنکا تنکا اٹھا کے دیکھ لیا

تیرے محیط میں کوئی جوہر زندگی نہیں
دیکھ چکا میں موج موج ڈھونڈ چکا صدف صدف

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

پھول چننا ہنسی کی بات نہیں
پیرہن تار تار ہوتا ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

تمنا ہے کہ وہ اڑ کر ترے روضے پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

اسی باعث تو قتل عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

نکہت گل پھر کہاں باد بہاری پھر کہاں
باندھ لے اے باغباں اپنی ہوا دو چار دن

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
ایک بھی دھبہ لہو کا تیغِ قاتل پر نہیں

راستے اور بھی ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اتر جاتے ہیں آسانی سے

قلم کو زہرہ نہیں رقم کا ہے دل میں دفتر بھرا الم کا
ورق ہے جو اس کتابِ غم کا وہ ایک دیوان ہے حزیں کا

اے حشر جلد کر تہہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

دفتر پارینہ سارا منتشر ہونے کو ہے
یہ نظام زندگی زیر و زبر ہونے کو ہے

اے سر شوریدہ بس تھوڑی سی شورش اور بھی
روزن دیوار زنداں بڑھ کے در ہونے کو ہے

اک نہ اک دن دہر میں ہو کر رہے گا انقلاب
آج ہی پھر کیوں نہ ہوجائے اگر ہونے کو ہے

گل ہوگئے ہیں خود ترے دامن کے فیض سے
ایسے بھی کچھ چراغ تری انجمن میں ہیں

ہمیں تو خیر اندھیرے ہی میں رکھا سب نے
جو دیدہ ور تھے وہ کیوں روشنی کی نذر ہوئے

سر سے کلاہ ہاتھ سے دستار رکھ چلے
اک سر بچا تھا وہ بھی سرِدار رکھ چلے

شاید ہمارے بعد ہوا سازگار ہو
ہم اک چراغ پھر سرِ دیوار رکھ چلے

تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خون بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

وفا کے باب میں کارِ سخن تمام ہوا
مری زمین پہ اک معرکہ لہو کا بھی ہو

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

تمام شہر مکرم بس ایک مجرم میں
سو میرے بعد مرا خون بہا نہ مانگے کوئی

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں

ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ تیرے وحشی کو
مزاج پرسیٔ بادِ صباء گوارا نہیں

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

کسے معلوم اہل ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

میرے ہاتھ عصا سے خالی
ہاتھ عصا سے خالی ہوں تو ہستی دو بھر ہوجاتی ہے

ہوا مخالف ہوجائے تو لہر سمندر ہوجاتی ہے
موت مقدر ہو جاتی ہے

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر
اور ایک اکیلا میں میرے ہاتھ عصا سے خالی

بدلتے موسموں کی دُھول ہوتے راستوں کو
تھکے ہارے مسافر یاد آئیں گے نہیں کیا

وہ عجیب رات تھی سارے شہر میں اک چراغ نہیں جلا
مگر ایک لکیر لہو کی ایسی کھنچی کہ نور ہی نور ہے

میں چراغ لے کے ہوا کی زد پہ جو آ گیا ہوں تو غم نہ کر
میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ہاتھ پہ ایک ہاتھ ضرور ہے

مرگِ جگر پہ کس لیے آنکھیں ہیں اشکبار
یہ واقعہ اہم ہے مگر اس قدر نہیں

اک خون کا دریا ہے کہ تاحدِ نظر ہے
اور کوئی سنگر بھی نہیں اپنا ہی گھر ہے

میری دعا قبول بھی ان کے کرم سے ہوگئی
دستِ طلب مرے ابھی بہر دعا اٹھے ہی تھے

رحمت بے حساب نے اپنی پناہ میں لے لیا
بہر حساب ہم ابھی روز جزا اٹھے ہی تھے

نصرت حق نے آن کر ان کی رکاب تھام لی
نصرتِ حق کے واسطے صدق وصفا اٹھے ہی تھے

عدل و کرم کے ہاتھ نے ان کو جھٹک کے رکھ دیا
اہل جفاء کے ہاتھ ابھی بہر جفا اٹھے ہی تھے

مٹ بھی جاؤں تو مرا کر دار ہی رہ جائے گا
ہاتھ میں دشمن لئے تلوار ہی رہ جائے گا

سمندر اس قدر شو ریدہ سر کیوں لگ رہا ہے
لبِ ساحل بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

وہ جس کی جرات پرواز کے چرچے بہت تھے
وہی طاہر ہمیں بے بال و پر کیوں لگ رہا ہے

در و دیوار اتنے اجنبی کیوں لگ رہے ہیں
خود اپنے گھر میں آخر اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

وہ دنیا تھی جہاں تم روک دیتے تھے زبان میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

کیوں کسی غیر کی آشفتہ بیانی لکھتے
وقت ملتا تو ہم اپنی ہی کہانی لکھتے

فضل اک پھول سے چہرے کا خیال آتا تھا
ورنہ ہم دہر کے ہر نقش کو فانی لکھتے

رات کو خواب میں دو زلفِ پریشاں دیکھیں
ظاہرہ ہوتی ہیں اس خواب کی تعبیریں دو

یا تو دو مارِ سیاہ جان کے خواہاں ہوں گے
یا جنوں پاؤں میں پہنائے گا زنجیریں دو

یہ عمر بیت گئی دشت و در بدلتے ہوئے
عذاب و ہجر کے موسم میں گھر بدلتے ہوئے

پرندے نقل مکانی تو کرتے رہتے ہیں
مگر یہ اڑتے نہیں بال و پر بدلتے ہوئے

ستون دار پہ کب تک رکھیں سروں کے چراغ
یہ ہاتھ شل ہوئے جاتے ہیں سر بدلتے ہوئے

✔ خدا گواہ ان آنکھوں نے میری دیکھا ہے — کبھی نظر کبھی اہل نظر بدلتے ہوئے
✔ ہر ایک موڑ پہ قاتل ہمارے اپنے تھے — یہ راز ہم پہ کھلا رہ گزر بدلتے ہوئے
✔ دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے — اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
✔ کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر میں لیکن — گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے
✔ میں ایسے جمگھٹوں میں کھوگیا ہوں — جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے
✔ چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا — کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
✔ وہ فاصلہ تھا دعا اور مستجابی میں — کہ دھوپ مانگنے جاتے تو ابر آجاتا
✔ چراغ ہجر مسلسل جلائے جاتا ہوں — کبھی ہوا کا ادھر سے گزر نہیں ہوتا
✔ زیست کے اندھے کنوئیں میں کس کے آوازہ لگا — کوئی پتھر پھینک کر پانی کا اندازہ لگا
✔ کیا قیامت ہے کہ ذرے کا بھی دل ٹوٹ گیا — سوچتا ہوں کہ کہیں جائے اماں ہے کہ نہیں
✔ ہوائیں تیز بہت ہیں یہ چاہتوں کے دیے — ذرا سنبھال کے اپنے مکان میں رکھنا
✔ یہ ہجر کی شب جو تیرہ تر ہے دراز تر ہے محیط تر ہے — کہانیاں تیری کہتے کہتے یہ رات ہم بھی گزار دیں گے
✔ اپنے کعبے کی حفاظت ہمیں خود کرنی ہے — اب ابابیلوں کا لشکر نہیں آنے والا
✔ ترے جانے سے ہر شے میں کمی ہے — بس اک صدمہ زیادہ ہورہا ہے
✔ نظر کو جستجوئے شوق میں پتوار کرنا ہے — مجھے کاغذ کی ناؤ پر سمندر پار کرنا ہے
✔ مجھے جانا ہے اک شہر طلسم آثار کی جانب — وہاں سوئے ہوئے ہر شخص کو بیدار کرنا ہے
✔ میں چل رہا ہوں مگر کس طرف نہیں معلوم — مجھے خود اپنے سفر کا ہدف نہیں معلوم
✔ کس انتشار کے جنگل میں بھٹکی نسل ہیں ہم — ہمیں ہمارا مقام اور صف نہیں معلوم
✔ وہ معرکہ تھا حقیقت کا یا کہ خواب کی جنگ — کہاں یہ عمر ہوئی ہے تلف نہیں معلوم
✔ بس ان کے سینوں میں اک چیز دل کے نام کی تھی — ہمیں کچھ اور نشانِ سلف نہیں معلوم
✔ محیط وقت میں معزول دل بھی دنیا بھی — کیا ہے کس نے کسے بر طرف نہیں معلوم
✔ رچے بسے ہوئے دکھ میں ادب کے آخری لوگ — یہی دو چار ہیں بس اپنے ڈھب کے آخری لوگ
✔ کچھ اور دن یہ حوالے ہیں ربط و نسبت کے — ہم اہل عشق ہیں نام و نسب کے آخری لوگ
✔ خوشی کا لفظ سکھایا کریں گے بچوں کو — بچے کھچے ہوئے عہد طرب کے آخری لوگ
✔ یہی تو آن ہیں ہارے ہوئے قبیلے کی — اک انتقام پہ زندہ غضب کے آخری لوگ
✔ کریں گے کیسے قیامت کا سامنا وہ ریاض — بکھرتی ٹوٹتی دھرتی پہ رب کے آخری لوگ
✔ فیصل بکھر گیا ہوں اسے مانگنے کے بعد — یہ میں گرا وہ ٹوٹ کے دست دعا گرا
✔ ہر اک کے ہاتھ پہ اک بے گناہ کا خوں ہے — تمام لوگ ہی قاتل ہیں اس کہانی میں
✔ میں نے جب ڈوبتے سورج کو بہ حسرت دیکھا — روشنی ہم تجھے دیں گے مرے آنسو بولے
✔ تصویر بہار اب نہ کھینچو — ٹہنی سے پرند اڑ گیا ہے

✔ آتش ہجر کلیجے میں دبی رہتی ہے
تم نے جس دن سے لگائی ہے لگی رہتی ہے

✔ ہوں تو میں شاخ مگر پھل نہیں لگتے مجھ میں
میری قسمت سے ہی پھولوں میں کمی رہتی ہے

✔ رات سر پر ہے پرند و مستقرمت بھولنا
آسمانوں میں اڑو لیکن شجر مت بھولنا

✔ اک نئی رُت کے سفر پہ جانے والے قافلو
اپنی مٹی اپنے موسم اپنے گھر مت بھولنا

✔ سربام ہوا کب تک جلے گا
یہ مٹی کا دیا کب تک جلے گا

✔ کہا میں نے کہ میں جلتا ہوں غم سے
ان آنکھوں نے کہا کب تک جلے گا

✔ بس اک ضرب کی مار تھے سب درخت
بہ ظاہر تن آور مگر کھوکھلے

✔ کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

✔ بہت چراغ بجھے اب کے وہ چراغ بجھاؤ
کہ جس کے بعد اجالا دکھائی دینے لگے

✔ ہمارے بعد خلق خدا آتی رہے گی
دریچے کھول کر رکھنا ہوا آتی رہے گی

✔ خلق نے ایک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

✔ منا دی شہر میں کر دو کہ ڈھونڈو
وہ انساں آنکھ جس کی تر نہیں ہے

✔ یہ کیا ستم ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

✔ آپ کہتے ہیں پرایوں نے کیا ہم کو تباہ
بندہ پرور کہیں اپنوں ہی کا یہ کام نہ ہو

✔ اپنی اس تحریک میں ایسے اٹھاؤں گا شہید
جن کے مدفن کو زمین انبیاء دینی پڑے

✔ اتنا کردوں گا میں ماؤں کی محبت کو بلند
دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے

✔ میرے ہمراہی کریں گے اس طرح جانیں نثار
ذرے ذرے کو دعائے مغفرت دینی پڑے

✔ ستم گروں سے ہمیں اس قدر ہی کہنا ہے
یہ طوق و دار تو اہل وفا کا گہنا ہے

✔ رگ گلو میں بہے یا وفا کی راہوں میں
لہو کی جوئے رواں ہے اسے تو بہنا ہے

✔ سکوں انہیں بھی میسر نہ آسکے گا کبھی
ستم گروں کو بھی اس حشر گہہ میں رہنا ہے

✔ کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے کیا لوگ تھے زنداں میں بھی ہم سے پہلے

✔ ایوان سے نکلے سر بازار بھی آئے
سردار وہی ہے جو سرِ دار بھی آئے

✔ ہم سہل طلب کون سے فرہاد ہیں لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

✔ کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری
اب لئے پھرتا ہے دریا ہم کو

✔ گریں ہزار نشیمن پہ بجلیاں لیکن
ہمیں بھی ضد ہے نشیمن وہیں بنائیں گے

✔ وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

✔ پکارتی ہے سر شام دل کی ویرانی
چراغ دے کوئی اجڑے ہوئے مکاں کے لئے

✔ جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
جہاں سے چاہیں گے رستہ وہیں سے نکلے گا

✔ کہاں آئیں گے ایسے بادہ کش اے میکدے والو
چلے گا یوں تو دور ساغر و پیمانہ برسوں تک

✔ ہری ہے شاخ تمنا ابھی جلی تو نہیں
جگر کی آگ دبی ہے مگر بجھی تو نہیں

✔ جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی کٹی ہے بر سر میداں مگر جھکی تو نہیں

✔ بلاتی ہیں موجیں کہ طوفاں سے کھیلو کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

✔ اک آگ سی تو مرے تن بدن سے اٹھتی ہے لہو کی لہر بیاض کفن سے اٹھتی ہے

✔ تو پکارے گا تو اے صحن حرم آئیں گے اب ابابیلوں کے انداز میں ہم آئیں گے

✔ لے کے ہم آئیں گے ہاتھوں میں صداقت کے علم یہ الگ بات کہ تعداد میں کم آئیں گے

✔ آج بھی منزلوں پہ لگی ہے نظر دل میں رکھتے ہیں عزم سفر آج بھی دل شکستہ نہ سمجھے زمانہ ہمیں اپنی ہمت ہے سینہ سپر آج بھی

ان کہی سے ڈرتے ہو جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو

اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو روشنی سے ڈرتے ہو اور ابھی سے ڈرتے ہو

خون بن گیا میرا نور کی زباں بن کر ہاتھ بول اٹھے ہیں صبح کی اذاں بن کر

آج پائے شہیداں میں زنجیر پا ایسی چھنکی کہ تیغِ قضاء ہوگئی دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی ایسی کھنکی کہ بانگ درا ہوگئی

وہی ریگ زار ہے وہی آبشار ہے خون کا وہی دستِ ظلم جس سے نہیں کوئی امید کرم

یہاں تیرگی وہاں تیرگی شبِ تار ہر سو بکھر گئی وہ جو موجِ خوں تھی گزر گئی مگر ایک ایسی بھی موج تھی

سر شاخسار تڑپ اٹھی مرا پاؤں چھو کے نکل گئی

ہے اک طلسم عجب شہر سر شناسی کا ادھر جو پاؤں اٹھے ہیں تو سر گئے ہیں یہاں

ہے تیرے جبر میں وہ لطفِ اختیار کے بس تمام نیزے دلوں میں اتر گئے ہیں یہاں

میں تو صفوں کے درمیاں کب سے پڑا ہوں نیم جاں میرے تمام جاں نثار میرے لئے تو مر گئے

بے خبران خوش ادا خوش نفسان بے نوا تیرہ نصیب تھے مگر شہر میں نام کرگئے

ہم ہیں جس قبیلے میں اس میں سچ پہ کٹ مرنا رسم ہے قبیلے کی اور بہت پرانی ہے

وہ معرکہ تھا حقیقت کا یا کہ خواب کی جنگ کہیں یہ عمر ہوئی ہے بسر نہیں معلوم

کچھ اور دن یہ حوالے ہیں ربط و نسبت کے ہم اہل عشق ہیں نام و نسبّ کے آخری لوگ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہم عشق سے کیا واقف واقف ہیں تو بس اتنا آغاز ہلاکت ہے انجام خدا جانے

ہزار دکھ میں بھی مجھ کو گلے سے روکتی ہے وہ اک خوشی جو مجھے خوں سے دستیاب ہوئی

بھرا جہان تھا بیداریوں کے نرغے میں وہی تھی عمر ہماری جو صرفِ خواب ہوئی

کٹی ہے عمر کجاووں میں خواب ڈھونڈتے ہوئے کسی سفر میں نہ تعبیر ہم رکاب ہوئی

منتظر ان کے بھی تنہائی کے غم آگے ہیں کیا ہوا ہم سے جو وہ چند قدم آگے ہیں

دل گرفتہ ہیں ہم اس منصب تنہائی پر ہم خوشی سے نہیں با دیدۂ نم آگے ہیں

مانگے سے کیا مراد نہیں مل گئی مجھے خوناب ہو گیا تو زمیں مل گئی مجھے

دل سے نکال دی گئی خواہش سوال کی جنگل سے ایک اور شجر کم کیا گیا

کوچ کر جائیں کسی اور نگر کی جانب
منزلِ خواب سے آگے کسی در کی جانب

ایسی بے مہر فضاؤں سے بہاروں سے پرے
چاند سے دور کہیں اور ستاروں سے پرے

اب چلے جایئے گر ساتھ ہوا لے جائے
اب چلے جایئے جس سمت خدا لے جائے

یہی خطا ہے کہ اس دار و گیر میں ہم لوگ
دل شگفتہ جبینِ کشادہ رکھتے ہیں

وہ بھی محفل دیکھی ہے مری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

جب فرق بے کُلاہ ہوا چین آ گیا
راحت زیادہ تر ہو اگر تن پہ سر نہ ہو

انقلاب آنے کو ہے سنبھلو لکھا تھا جن پر
یاں فضاؤں میں غبارے وہ ہمیں نے چھوڑے

الزام اپنے خون کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہو کا جہاد تھا

فصیل شہر پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارے بدن کا خون رواں مُشت پر میں تھا

نشیمن پھونکنے والی ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سر رکھ دیا خاکِ نشیمن پر

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگی داماں کیا گیا

لالہ گوں ہے ترا خیال مگر
اس میں کچھ حسرتوں کا خون بھی ہے

اے حشر جلد کر تہہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

ہر چند کہ بگولہ مضطرِ ہے اک آگ تو اس کے اندر ہے
بے چین سہی بے تاب سہی ناکام سہی برباد سہی

کھلتا تھا کبھی جس میں شہادت کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
بگل خونیں جب بجا مسجد لہو سے بھر گئی

ستم گر تجھ سے امید کرم ہوگی جنھیں ہوگی
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہادوں گی اسے توڑ کے ساحل کی حدود اور پھر گنبدو مینار بھی پانی پانی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو

بام پر چڑھ جا ذرا للکار دے خورشید کو
اب تقابل کے لئے تیار ہے چہرہ ترا

قطع مسافت جلدی ہو
راہوں کو شمشیر کریں

لمحہ ماہ و سال بنے
حلقے کو زنجیر کریں

ساحل پہ لوگ یونہی کھڑے سوچتے رہے
دریا میں ہم جو اترے تو دریا اتر گیا

ایسی چلی ہے شہر میں خود غرضیوں کی رسم
کچھ سوچ کر صلیب سے عیسیٰ اتر گیا

تھمتے تھمتے ہی تھمیں گے آنسو
رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

سر بلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر آگئے

وطن فروش نہیں سر فروش ہیں ہم لوگ
ہزار سال سے خانہ بدوش ہیں ہم لوگ

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پر زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

سوچتے رہنے سے تو منزل کبھی ملتی نہیں
چلتے جاؤ راستے سے راستہ مل جائے گا

ترے حق میں دوستوں کا یہی فیصلہ ہے عاجز
کہ گناہ سے ہے بڑھ کر ترا جرم بے گناہی

آنکھ پر نم ہے اور اس پہ جگر جلتا ہے
کیا تماشہ ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

تم نے دیکھی ہی نہیں ہمتِ مردان وفا
زندگی ہے تو دکھادیں گے کسی دن مرکے

کچھ اس میں شک نہیں اس نوجواں نے خوب کیا
مقابلہ تو مرے پہلواں نے خوب کیا

تری یاد باقی ترا غم سلامت
بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں

کب ہوا کامیاب فردوسی
جب وہ فردوس کو روانہ ہوا

ضعیف اگر نظر پڑے رسولؐ کا جمال بن
قوی اگر ہو سامنے تو قہر ذو الجلال بن

خدا کے آگے سر جھکا کہ سرکشوں کا سر جھکے
قضاء ستم گروں کی بن ستم زدوں کی ڈھال بن

ادھر آ مہرباں ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

لبوں پہ دم ہے تڑپتے ہیں درد مند ترے
وہ اور کوئی نہیں عاشقانِ چند ترے

کبھی جنگل کبھی دربار سے جا ملتا ہے
سلسلہ وقت کا تلوار سے جا ملتا ہے

میری آواز کہیں روشنی بن جاتی ہے
تیرا لہجہ کبھی سنسار سے جا ملتا ہے

رام ہر چند کئی لوگ بچھڑ جاتے ہیں
قافلہ قافلہ سالار سے جا ملتا ہے

سفینوں کے بھروسے پر خدا کو بھولنے والو
سفینوں کو تو ہوتے غرقِ طوفاں ہم نے دیکھا ہے

حفاظت جس سفینے کی انھیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

ہمارا پھول ہمارا چمن ہماری بہار
ہمیں کو جاء نہیں ملتی ہے آشیانے میں

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو

گھر کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسانا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

شیرازۂ حیات پریشاں ہوگیا
یہ مرحلہ بھی خیر سے آسان ہوگیا

ہم ہی اٹھے تھے بن کے صدائے جرس کبھی
اب کیا غبار بن کے چلیں کارواں کے ساتھ

دیکھوں تو اہل درد پہ کیوں چھاگیا سکوت
سینے سے دم نکل نہ گیا ہو فغاں کے ساتھ

جب تلک روشنیٔ فکر و نظر باقی ہے
تیرگی لاکھ ہو امکان سحر باقی ہے

لوگ چلتے گئے خوں اگلتے گئے
بس اسی طرح اک راستہ بن گیا

کیسی موجیں کیا منجدھار
اب کے کشتی آر کہ پار

زندگی کو کوئی مژدہ لب خونناب تو دے
موت کی آنکھ بھی کھل جائے گی آواز تو دے

کس کا یقین کیجیے کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں بزم یار سے لوگ خبر الگ الگ

مری ہمتوں کو مٹانا ہے مشکل
سمندر میں اب اتنا پانی نہیں ہے

یہ داستان درد کی ابھی نہ چھیڑ ہمنشیں
کہ موت آ گئی انہیں نہیں نہیں یقین نہیں

ایسی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات
دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

مجھے یہ ڈر ہے صباء لڑکھڑا کے گر نہ پڑے
پیام لے کے چلی ہے شکستہ حالوں کا

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

بہتے ہیں سدا آنکھوں سے یاں خون کے دریا
یہ کام تو ہر گز یم قلزم سے نہ ہوگا

پر کتر کر مجھے کہتا ہے کہ گلشن سے نکل
ایسی بے پر کی اڑاتا نہ تھا صیاد کبھی

آہ کرنے سے تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں

خود بخود بوئے یار پھیل گئی
کوئی منت کش صباء نہ ہوا

نہ احساسِ طوفاں نہ امیدِ ساحل
نہ جانے کہاں جا رہا ہے سفینہ

وہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف
کہ طوفاں سے گزرا ہے جن کا سفینہ

یہ اہتمام چراغاں بجا سہی لیکن
سحر تو ہو نہیں سکتی دیئے جلانے سے

اس بے وفا کے حسن پر شیدا کیا ہے کیوں؟
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا ترا

ہمسفر اور بھی سرگرم سفر تھے لیکن
مجھ کو صیاد نے رفتار سے پہچان لیا

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

محل کے سامنے اک شور ہے قیامت کا
امیر شہر کو اونچا سنائی دیتا ہے

آندھیوں میں اک دیا جلتا ہوا رہ جائے گا
میں چلا جاؤں گا میرا نقش پاء رہ جائے گا

ستون دار پہ کب تک رکھیں سروں کے چراغ
یہ ہاتھ شل ہوئے جاتے ہیں سر بدلتے ہوئے

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

اہل دل آنکھ جدھر کھولیں گے
اک دبستانِ ہنر کھولیں گے

وہیں رک جائیں گے تاروں کے قدم
ہم جہاں رختِ سفر کھولیں گے

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

شکستہ پاء راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثالِ گرد سفر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

صبح کاذب ہے چلو مل کے اذاں دی جائے
اور یہ راہ کی دیوار ہٹا دی جائے

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں نہ جانے کب سے
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

وہ نہیں رہے وہ نہیں رہے تو پتہ چلا
یہ جو گرد اڑتی ہے گُوبہ گُو یہ جو چار سُو

کسی بے دلی کا حصار ہے
کوئی نیم سوز سی راکھ ہے کوئی بے جہت سا غبار ہے

اسی راکھ میں اسی گرد میں میری آنکھ سے تری آنکھ تک
وہی خواب اب کسی اور خواب کے درمیان ہے مشک بو

وہ جو خون خاک میں مل گیا مری فصلِ گل کی ہے آبرو
مرے شہر جاں کی بہار ہے

اسی تیرگی میں یہیں کہیں کسی روشنی کا مزار ہے
کوئی خواب تھا کسی اور خواب کے درمیاں

کوئی خواب تھا جو بکھر گیا وہ بکھر گیا تو ٹھہر گئیں
کئی سسکیاں سی ہواؤں میں وہ جو شہرِ شہرِ نگار تھا کسی آنکھ میں

اسی شہر جاں کی فضاؤں میں
وہی آنکھ دشتِ تیرگی کا ہدف بنی

وہ وجود پل میں ہی جل گیا وہ جلی جلی سی جو راکھ ہے
وہ جو خاکِ مسجدِ پاک ہے

اسی راکھ خاک کی کوکھ سے مری انگلیاں مری پسلیاں مری ہڈیاں
کبھی چن بھی لو کبھی دیکھ لو یہی راکھ حاصل زندگی

یہی زندگی یہی زندگی یہی روشنی یہی روشنی
کہ یہ روشنی ہے گراں بہت

کہ اندھیرا اب بھی چھٹا نہیں
مرا خون اب تک دُھلا نہیں

عزت صرف ایک بار ملتی ہے

علم دولت عزت کا بنیادی فرق

ایک زمانے میں تین دوست ہوا کرتے تھے۔ ایک دوست کا نام علم تھا دوسرے دوست کا نام دولت تھا تیسرے کا عزت تھا۔ ایک دن جب ان کے بچھڑنے کا وقت آیا تو علم اپنے دوستوں سے کہنے لگا کہ اگر تم دونوں مجھ سے ملنا چاہو تو میں کتب خانوں میں ملوں گا۔ دولت نے کہا کہ مجھ سے ملنا ہو تو میں محلوں میں ملوں گی مگر عزت خاموش رہی جب وجہ پوچھی تو جواب میں عزت نے انھیں کہا کہ میں اگر ایک دفعہ چلی جاؤں تو دوبارہ نہیں مل سکتی۔

اے اللہ میرے کھوٹے اعمال قبول کر لے: عجیب دعا

آخرت میں کامیابی کے لیے ہم دنیا کیسے بسر کریں:

غزنی میں رہنے والے بزرگ چقندر، شلجم اور ایسی ہی دیگر سبزیاں پکا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی کھوٹا سکہ بھی لے کر آپ کے پاس آتا تو سودا دینے سے انکار نہ کرتے بلکہ کھوٹا سکہ لے کر سودا دے دیتے تھے۔ اس عادت کی وجہ سے لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ انھیں کھوٹے اور کھرے کی پہچان نہیں۔ جب ان بزرگ کے انتقال کا وقت آیا تو آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا میرے اللہ تو جانتا ہے کہ میں لوگوں کے کھوٹے سکے جان بوجھ کر قبول کرتا تھا تو بھی میرے کھوٹے اعمال اپنی خاص عنایت سے قبول فرما۔